معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ, شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۱، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۰۹ء

استدراکات

''معیار''، جلد:۱، شمارہ:۱

''تاریخِ شاہ جہان پور کے مآخذِ مطالعہ وتحقیق'' از ابوسلمان شاہجہاں پوری، ص ۲۹-۵۳

اخبارِ محبت تالیف نواب محبت خان محبت کا تعارف بہت ہی تشنہ ہے۔ یہ دراصل ہندوستان کے سلاطین کی عمومی اور مختصر سی تاریخ ہے جس میں ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ھ تک کے واقعات درج ہیں۔ لیکن مؤلف نے اس میں اپنے اجداد کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کا تعلق شاہ جہان پور سے تھا اس نے اپنا شجرہ یوں دیا ہے:

محبت خان بن فیض عطا خان بن صالح محمد خان بہادر بن مرتضیٰ خان بن فتح معمور خان بن دیر خان (ف ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ھ) اس دیر خان کے بڑے بھائی بہادر خان شاہ جہان پور کے بانی تھے (ریو: فہرست مخطوطات موزۂ برطانیہ ۳/۹۱۱ سٹوری ۱/۱/۴۷۳)۔

اخبارِ محبت کے دو خطی نسخے پائے جاتے ہیں (۱)۔ برٹش میوزیم (۲)۔ انڈیا آفس لائبریری (اسٹوری ۱/۱/۴۷۳) ایلیٹ نے اس کتاب کے بعض اقتباسات کا انگریزی ترجمہ بھی دیا ہے (تاریخ ہند ۸/۳۷۶-۳۹۳؛ نیز دیکھئے: فہرستوارہ ۲/۱۱۲۶)

فاضل مقالہ نگار نے تذکرۃ الاحباب مؤلفہ نواب محمد خان کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ مطیع کے مؤلف نے ان کی تالیف میں ''مناقب رزاقیہ'' کا بھی ذکر کیا ہے، جو مؤلف تاریخ مطیع کی غلط فہمی ہے۔

مناقبِ رزاقیہ (درحالات مولانا سید عبدالرزاق ہانسوی) مؤلفہ مُلا نظام الدین محمد (بانی درس نظامی) کی تالیف ہے جو کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر نواب محمد خان کی دو اہم کتابیں اول ملفوظِ رزاقی اور دوسری کراماتِ رزاقیہ ہیں جو چھپ چکی ہیں۔ ملفوظ رزاقی کے آغاز میں انھوں نے اپنا نام احقر العباد ہیچ مدان محمد خان رزاقی عفی اللہ عنہ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ میں حضرت شاہ عبدالرزاق ہانسوی کے پوتے شاہ غلام علی ہانسوی بن سید غلام دوست محمد بن شاہ عبدالرزاق ہانسوی کا مرید ہوں اور ان کی زبانی میں نے ''بے کم وکاست'' ملفوظات جمع کیے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق چوں کہ اکثر زبانِ ہند (مقامی بولی اُردو و ہندی) میں یہ بات کرتے تھے اس لیے اس کتاب میں بہت سے جملے اس زبان کے درج ہوئے ہیں۔ اس لیے یہاں بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف تاریخ مطیع کو سہو ہوا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ نواب محمد خان نے ظاہری علوم شاہ محمد اسحٰق دہلوی سے حاصل کیے (شعر منقولہ مقالہ) اور سلوک کی تکمیل شاہ غلام علی ہانسوی سے کی۔

نواب محمد خان کی دو تالیفات ملفوظِ رزاقی اور کراماتِ رزاقیہ کا ذکر مفتی محمد رضا انصاری نے کتاب بانی درسِ نظامی (ملا نظام الدین محمد) کے ص ۲۳۵ میں بھی کیا ہے۔ مقالہ نگار نے شعرائے عجم وہند کے تحت تذکرۃ الاحباب کو نواب مصطفیٰ خان کی تالیف

بتایا ہے۔اور عنوان تذکرۃ الاحباب کے تحت اسے نواب محمد خان کو مؤلف تذکرہ لکھا ہے۔ یہ کیسا تضاد ہے؟

محمد اقبال مجددی
شعبۂ تاریخ، اسلامیہ کالج، لاہور

☆☆☆

''خازن الشعراء: ہندوستانی وایرانی علماء وشعراء کا ایک تذکرہ'' از عارف نوشاہی، ص۹۳۔۱۱۵

اس مقالے کے حوالے سے عرض ہے کہ پورے مقالے میں مصنف کے اسلوبِ نثر وشعر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا، ہر چند مختصر ہی کیوں نہ ہوتا، ہونا چاہیے تھا۔ص۹۵ پر دی گئی کتابوں کی فہرست میں ۲۶ نمبر پر موجود نام میں ایک لفظ ''مردان'' فارسی ہے، باقی سارا نام عربی میں ہے؟ نام سے ظاہر ہے کہ کوئی فقہی موضوع ہے۔ص۹۶، شمار۳۹: ہدایۃ درست ہے۔ص۱۰۶ محمد تحیی انصاف کا پہلا مصرع: ''موہے'' بھی کھینچ تان کے بامعنی ہو جاتا ہے لیکن ''موئے'' اصحّ ہے۔اس صفحے پر انشا اور شہید کے اشعار نے بہت محظوظ کیا۔شہید کا مطلع بہت استادانہ، زوردار اور شعریت سے سرشار ہے۔

ص۱۰۷، سطر۱۲: ''تطویل محلّ عادتِ اوست'' کو میرے خیال میں ''تطویلِ مُخِلّ، عادتِ اوست'' ہونا چاہیے۔اس صفحے پر حضرت خان آرزو کے جو محاسن بیان ہوئے ہیں، وہ اُس عہد کے چشتی بزرگوں میں شہرت رکھتے تھے۔ میں نے کسی اور ماخذ میں بھی ایسا کچھ پڑھ رکھا ہے، ذہن پہ بہت زور دیا ہے مگر کچھ یاد نہیں آ رہا کہ کہاں پڑھا ہے۔اُن کے اکثر اہلِ شعر وادب قریبی احباب بھی انھی کی طرح خوش گزران تھے۔اگرچہ میر تقی میر بھی ان سے خوش نہیں تھے مگر رشتے کا لحاظ کر گئے اور ان کے پول نہ کھولے۔حضرت میرزا مظہر جان جاناں کی رائے درست اور قابل داد ہے۔ یہاں ایک ضمنی ذکر بھی ہو جائے: چند دن پہلے مثنوی معنوی پڑھ رہا تھا تو یہ مصرع نظر سے گزرا:

جانِ جاناں مظہرِ اللہ شد

خیال آیا کہ مولانا نے حضرت مظہر جان جاناں کا سجع کہا ہے! اس سے اچھا سجع کیا ہو سکتا ہے!

حضرت جان جاناں کی دادی جان درسِ مثنوی میں بے حد معروف تھیں۔ بسا اوقات ایسا حسنِ اتفاق ہوتا ہے یا ذہن کسی ایسے نکتے کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ لطف آ جاتا ہے۔ یہ سب انھی اہلِ دل کے تصرّفات ہیں۔

ص۱۰۸، سطر۲۲، پروف کی غلطی سے ''صاحبِ کثیر التصانیف'' ہو گیا ہے! یہ آخری پیرا سارے کا سارا فعل ماضی بعید یا ماضی استمراری میں ہے، اس تناظر میں آخری فعل ''کوشش کرتے ہیں'' محلّ نظر ہے۔ص۱۰۹، سطر۱۰: قولِ واقف بٹالوی کہ ''مولوی [رومی] کے قول سے سند نہیں لینی چاہیے کی توضیح یہ ہے کہ غالباً واقف نے یہ بات الفاظ کے تلفّظ واعراب کے باب میں کہی ہو گی اور محض اس لیے کہ مثنوی معنوی میں خصوصاً ضرورتِ شعری اور وفورِ معانی کے تحت تلفظ کے معاملے میں بہ کثرت اجتہادات موجود ہیں جو مولانا کا خاصّہ ہیں اور استثنائی معاملہ ہے اور دوسروں کے لیے نہ سَند ہے، نہ واجب التقلید۔ وگرنہ کہاں حضرت مولوی اور کہاں حزیں لاہیجی! حزیں کی زبان البتہ صاف اور

تلفّظ معیاری ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار بھی بالعموم نقلِ قول میں ناقص ہیں اور صاحبانِ قول بھی شاید محققانہ انداز میں بات کے عادی نہ تھے۔ سبکِ خراسانی کے اوائل کے تمام شعرا کے ہاں تلفظ و اعراب کی خامیاں کثرت سے ہیں، سبکِ عراقی کے اکابر کے ہاں بہ قدرِ اقلّ قلیل۔ صرف صوفی شعرا، خاص کر مثنوی گو حضرات کے ہاں یہ مسائل باقی ہیں اور وہ بھی زیادہ نہیں سوائے مثنوی معنوی کے۔ سبکِ ہندی والے تو زبان کی صفائی، محاورے کی چُستی اور تلفظ کی رعایت کی کمائی ہی کھاتے رہے ہیں، سو سبکِ خراسانی یا عراقی کے صوفیہ کا، سبکِ ہندی کے اہلِ زبان شعرا کے ساتھ بہ سلسلۂ تلفظ کوئی تقابل بنتا ہی نہیں ہے، نہ ہی ایسا کوئی معیار وضع کیا جانا چاہیے۔

اسی صفحے پر، س۲۰، لفظِ درمیاں بدونِ اعلانِ نون کیوں ہے؟ یا اجتہادِ مدیر ہے یا سہوِ کاتب۔

..... اس اہم تذکرے کا اُردو میں تعارف..... ہم سب پر بہت احسان..... ہے۔ اسامی شعرا کی ترتیبِ نو سے مزید آسانیاں ہوں گی۔ فہرست کی ترتیبِ نو کا کام مصحّح محترم کو خود کر لینا چاہیے تھا، ان کے تسامحات کی جو نشان دہی آپ نے کی ہے، اس سے لگتا ہے کہ مزید اغلاط بھی ہوں گی۔

معین نظامی
شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج

☆☆☆

''علامہ اقبال کے ایک مکتوب اور مکتوب الیہ کی دریافت'' از خالد محمود سنجرانی، ص۱۵۹۔۱۷۳

میرے پسندیدہ ترین موضوعات میں ایک موضوع ''اقبال اور جرمنی'' بھی ہے۔ میری انگریزی کتاب ''اقبال اور گوئٹے'' (مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور) اور بلجیم میں منعقدہ ایک بین الاقوامی کانفرنس ''اقبال اور عصر جدید'' میں پیش کردہ مقالہ ''اقبال اور جرمنی'' میری اس علمی وابستگی کے مظہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی آپ کے مجلّہ کی فہرست مندرجات پر نظر پڑی تو یہ خالد محمود سنجرانی صاحب کے مضمون پر اٹک گئی اور سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کیا، چناں چہ اسی کے متعلق چند معروضات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے اس مضمون کے عنوان یعنی ''علامہ اقبال کے ایک مکتوب اور مکتوب الیہ کی دریافت'' کے متعلق یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ تو درست ہے کہ اس میں جس جرمن خط کا عکس دیا گیا ہے (جس کا پڑھنا قدرے ناممکن ہے) وہ تو یقیناً دریافت کے زمرے میں آتا ہے اور اسے اقبال کے نام مکتوبات میں اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جہاں تک اس عنوان کے دوسرے حصے یعنی مکتوب الیہ کی دریافت کا تعلق ہے، وہ محلِ نظر ہے، کیوں کہ اقبال کے اس پرانے جرمن دوست کے نام سے زیادہ نہ سہی، سوانح اقبال سے دلچسپی رکھنے والے بعض اصحاب ضرور واقف ہیں اور انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں راقم نے ایک مضمون ''اقبال کا آخری ملاقاتی'' کے زیرِ عنوان قلم بند کیا تھا جو آج سے برسوں پہلے ''نوائے وقت'' کے سنڈے ایڈیشن میں طبع ہوا تھا۔ مختصراً اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک عشرہ پہلے اقبال اکادمی کی جانب سے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ اقبال میوزیم میں تحریری طور پر جو کچھ دستیاب ہے اس کی عکسی نقول تیار کی جائیں۔ محکمہ

آثار قدیمہ کی اجازت اور اکادمی کی فراہم کردہ تمام سہولتوں کے بعد دو ہفتوں میں یہ اہم ترین منصوبہ اختتام پذیر ہوا اور تمام تحریری سرمایہ عکسی صورت میں اکادمی کے کتاب خانہ میں منتقل کر دیا گیا۔ مختلف النوع نوادر کے علاوہ اقبال میوزیم میں محفوظ چند جرمن مستشرقین کے خطوط بنام اقبال بھی دستیاب ہوئے۔ جنھیں بعد میں ترجمے اور ضروری حواشی سمیت شائع کر دیا گیا۔ انھی میں اس جرمن سیاح ہانس ہاسوفان ویلتائم اوسٹراؤ (سنجرانی صاحب نے اس نام کو جس طرح لکھا ہے، وہ جرمن زبان کے قواعد کے مطابق درست نہیں) کا ایک برقی تار بھی موجود تھا، جو انھوں نے ہندستان پہنچنے کے بعد اقبال کو بھجوایا تھا اور اس میں لاہور آنے اور ان سے ملنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ قبل ازیں اس نے اقبال کی ساٹھویں سالگرہ (جنوری ۱۹۳۸ء) پر کارڈ بھجوایا تھا جس میں اس نے اقبال کو اپنے مستقبل کے سفر ہند سے بھی مطلع کیا تھا اور اس کو خوش آمدیدی مراسلہ بھی لکھا تھا۔ ابھی وہ لاہور سے سری نگر پہنچا ہی تھا (۲۳ اپریل) کہ اسے اخبارات کے ذریعے اقبال کے انتقال کی خبر ملی۔ چناں چہ اس نے وہیں سے جاوید اقبال کے نام تعزیت نامہ ارسال کیا۔ افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود سالگرہ کا تہنیتی کارڈ اور یہ تعزیت نامہ دستیاب نہیں ہو سکے، لیکن اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ویلتائم ہندوستان آنے کے بعد اقبال کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہے۔

ویلتائم نے ہندوستان سمیت دیگر ایشیائی ممالک سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات کو ''روزنامچۂ ایشیا'' کے عنوان کے تحت جرمن زبان میں طبع کرایا جس کی جلد اول ہامبورگ سے ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس جلد کے تین صفحات (۱۳۸، ۱۴۵ اور ۱۶۲) پر اس نے اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کی سہ پہر کو وہ اقبال منزل پہنچا اور گھنٹوں ان سے گوئٹے، جرمنی اور ہندستان کے تعلقات اور مختلف ایشیائی ممالک میں چلنے والی تحریکوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ ملاقات خاصی طویل تھی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد اقبال سو گئے۔ رات دو بجے سینے میں شدید درد ہوا اور وہ اٹھ گئے اور علی الصبح ساڑھے پانچ بجے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یوں اس نے خود کو اقبال کا آخری ملاقاتی گردانا ہے۔ ویلتائم کے روزنامچہ میں مرقوم تفصیلات متعلقہ اقبال کا انگریزی ترجمہ بھی اس کی طباعت سے چار سال بعد ہی ہو گیا تھا، ۱۹۶۰ء میں پاکستان جرمن فورم (کراچی) کی جانب سے ''محمد اقبال، پوئٹ اینڈ فلاسفر'' انگریزی کتاب طبع ہوئی جو کلام اقبال کے انگریزی اور جرمن تراجم اور آنیماری شمل کے چند مقالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ویلتائم کے روزنامچہ کے ان اقتباسات کا انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے (ص ۹۱۔۹۳)۔

اقبال کے سوانح نگاروں، محققوں اور متخصّوں کے لیے ویلتائم کا نام زیادہ جانا پہچانا نہیں لیکن پھر بھی اقبال کے قریبی احباب بالخصوص آخری ایام علالت میں ان کی مزاج پرسی کے لیے آنے والے اصحاب اس کے نام سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اقبال کا آخری ملاقاتی تھا۔ ثبوت کے طور پر سطور ذیل میں محمد شفیع ایم۔اے (م ش) کے ایک مضمون بعنوان ''اقبال کے آخری چوبیس گھنٹے'' کا متعلقہ اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ جو اقبال کی وفات سے تین سال بعد ''نوائے وقت'' میں شائع ہوا اور یہیں سے اسے ''ہمایوں'' نے نقل کیا (بابت جون ۱۹۴۱ء) ملاحظہ فرمائیے:

''ساڑھے چار بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے ایک پرانے جرمن دوست بیرن خان والتھیم ملنے کے لیے آئے۔ یہ گاؤ تکیہ پر سر ٹیکے بیٹھے تھے۔ جوں ہی ان کے دوست نے کمرے میں قدم رکھا انھوں نے اس شیر کی طرح جو بڑھاپے میں بھی اپنا وقار قائم رکھتا ہے، گردن اٹھائی اور استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ بیرن نے اپنا تعارف کرایا کہ ہم طالب علمی میں میونخ یونیورسٹی میں دوست ہوا کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر بشاشت کی لہر دوڑ گئی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ان سے اپنی لینڈ لیڈی، اس کی بیٹی، اس زمانے کے دوستوں اور رفیقوں کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ ان کی اس گفتگو سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نووارد جرمنی کے بہت بڑے

''نواب'' ہیں اور اب مشرقی ممالک کی سیاحت کی غرض سے نکلے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب میں یہ بات بڑی تعجب انگیز تھی کہ ادھر تو وہ ابھی درد کی شدت سے تلملا رہے تھے، ادھر جونہی کوئی ایسا ملاقات آتا جو اپنی باتوں سے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکتا، آپ گفتگو میں ایسے محو ہو جاتے گویا انھیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔

اب بھی وہ اسی انہماک سے بیرن سے محو گفتگو تھے۔ افغانستان میں موسم کیسا ہوگا؟ وہاں کس قسم کے پھل ملتے ہیں؟ وہاں گوشت کیسا ہوتا ہے؟ افغانستان میں شکار کے کون کون سے جانور ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی بیسوں عنوانات پر ڈاکٹر صاحب گفتگو کرتے رہے۔

جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے یا جنھوں نے انھیں گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ بے مثل گفتگو کرنے والے تھے۔ وہ ہر مذاق اور ہر عمر کے آدمیوں سے بہت دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اگرچہ انھیں بولنے میں دقت ہوتی تھی، تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے باتیں کیے جاتے تھے۔ موسم اور آب وہوا کا موضوع بدلا تو جرمن فلاسفروں پر گفتگو شروع ہوگئی۔ جرمن فلاسفی کے تازہ رجحانات پر بھی انھوں نے اظہار خیال فرمایا۔

بین الاقوامی سیاسیات کا ذکر آنے پر آپ نے یہ فقرہ کہا:

These things are not to be talked of openly.

میں محسوس کر رہا تھا کہ بیرن بوڑھے شاعر کی نازک صحت کے پیش نظر گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتا۔ اس نے کہا بھی کہ میری موجودگی سے شاید آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

it is just the other way.Your breath is like balm to me.

بالآخر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بیرن والتھم صاحب نے اجازت طلب کی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا۔

حیاتِ اقبال کے متعلق ایسے بیشتر مصادر میں صرف اسی ایک ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ویلتائم نے بھی اپنے متذکرہ بالا روزنامچہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ ایک ہی بار اقبال سے ملے ہیں اور اس ملاقات کے چند گھنٹے کے بعد ہی وہ رحلت فرما گئے۔ معلوم نہیں سنجرانی صاحب نے ان کی دو ملاقاتوں کا کیسے ذکر کر دیا (رک: حاشیہ نمبر۲) اور وہ بھی کسی معتبر حوالے کے بغیر۔

سنجرانی صاحب نے مضمون کے آغاز میں اقبال اور ویلتائم کے مشترکہ دوست پروفیسر گلازنپ (Glasenapp) کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ''مجھے قدرے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ پروفیسر گلازنپ کے تمام ذاتی کاغذات، لائبریری اور دیگر دستاویزات جنگ کے زمانے میں تلف ہوگئی تھیں جب کہ وہ نہ صرف اقبال کے اہم معاصر، مترجم اور ان کے ملنے والوں میں سے تھے بلکہ جرمنی میں ہندیات کے بہت بڑے ماہر اور نقاد بھی تھے کہ جنھیں آج بھی جرمنی میں بہت عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں نے جرمنی کے ہر آرکائیو کے ساتھ ساتھ پروفیسر گلاسنیپ فاؤنڈیشن سے بھی رابطہ کیا جس کا مقصد ان کے کاغذات میں سے اقبال کے خطوط کی تلاش کرنا تھا لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ پروفیسر گلاسنیپ کے کاغذات تلف ہو جانے کے سبب دستیاب نہیں۔ ان کاغذات کے تلف ہو جانے کے ساتھ ہی ان میں اقبال کے مکاتیب وغیرہ کی موجودگی کا امکان بھی ختم ہو گیا''۔ حواشی کے ذیل میں (نمبر۷) انھوں نے اس جرمن پروفیسر کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی ہیں اور اس کا پورا نام Helmuth von Glasenapp لکھا ہے حالاں کہ علامہ اقبال کے مترجم کی حیثیت سے Utto von

glasenapp کا نام معروف ہے، جو جرمن اسٹیٹ بینک کے نائب صدر تھے اور برصغیر میں اپنے قیام نیز ہندیات سے ان کے دلچسپی کے شواہد انھوں نے اپنی جرمن کتاب ''دنیائے ہند'' میں قلمبند کر دیئے ہیں (مطبوعہ ۱۹۴۸ء) کلام اقبال کے اولین جرمن مترجم بھی وہی ہیں۔ چناں چہ پاکستان جرمن فورم (کراچی) کے پیش کردہ جس مجموعہ مقالات وتراجم کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) اور جس کا پیش لفظ ممتاز حسن مرحوم کا تحریر کردہ ہے، اس میں اوٹو (Otto) نے اقبال کی ان نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ گوئٹے (فارسی)، ایک شام (اردو)، صقیلہ (اردو)، مارچ ۱۹۰۷ء (اردو) اور پرندے کی فریاد (اردو)۔

مقالہ نگار حاشیہ میں رقم طراز ہیں کہ ہلموٹ نے ''اوائل عمری ہی میں اقبال کی نظم ''ایک شام'' کو جرمن زبان میں ڈھالا تھا۔'' ان تصریحات کی روشنی میں وہ خود ہی اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ اقبال کی فارسی اور اردو منظومات کے مترجم ہلموٹ ہیں یا اوٹو۔ اگر ان کا فیصلہ ثانی الذکر کے حق میں ہو تو انھیں پھر سے اپنی تلاش کا سفر کرنا چاہیے جس میں ان کو یقیناً ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

گو اقبال نے جرمنی (ہائیڈل برگ اور میونخ) میں چند ماہ ہی گزارے لیکن اس مختصر قیام نے ان کی شاعری، فکر، حتیٰ کہ ان کے مزاج اور جذباتی زندگی پر گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ اقبال کے سوانح نگاروں اور متعدد ماہرین اقبالیات نے ان کے جرمنی میں بسر کیے ہوئے ایام پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن پھر بھی کچھ سوالات ایسے ہیں، جو ابھی تک تسلی بخش جوابات کے منتظر ہیں، مثلاً:

۱۔ انگلستان سے چلتے ہوئے ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اقبال کو جو سفارشی خط بنام قرکس ہوبل دیا (رک: راقم کا مقالہ در: ماہ نو اقبال نمبر ۲۰۰۲ء)۔ اس کے حوالے سے تو انھیں سیدھا میونخ جانا چاہیے تھا کیوں کہ ان کے مقالۂ خصوصی برائے ڈاکٹریٹ کے نگران یعنی ہوبل صاحب تو وہیں کی دانش گاہ میں پڑھاتے تھے لیکن وہ پہلے ہائیڈل برگ میں رک گئے اور پھر دو ماہ سے زیادہ وہیں پر مقیم رہے۔ ہائیڈل برگ میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ؟

۲۔ ایک روایت کے مطابق انھیں اپنے مقالہ کے ''دفاع'' کے لیے جرمن زبان سیکھنا تھی اس لیے وہ ہائیڈل برگ میں رک گئے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو کیا وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے کسی شعبہ برائے غیر ملکی طلباء یا کسی پرائیویٹ ادارے میں داخل ہوئے اور اس زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ زبانی امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

۳۔ ہائیڈل برگ میں اقبال کہاں ٹھہرے؟ پاکستانی سفارت خانہ (جرمنی) نے ہائیڈل برگ کے جس گھر کے باہر پلاک لگوایا ہے، کیا وہ یہیں رہائش پذیر رہے؟ اس شہر کے پرانے ریکارڈ کے مطابق ۱۹۰۷ء میں اس گھر میں جو افراد بطور کرائے دار مقیم تھے ان میں اقبال کا نام موجود نہیں۔ کیا ان دنوں یہ کوئی ہاسٹل نما جگہ تھی، جہاں غیر ملکی طلباء کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا جاتا تھا؟ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ایوب خان کے دور حکومت میں جرمنی میں پاکستانی سفیر عبدالرحمٰن ہائیڈل برگ میں اقبال کی صحیح رہائش گاہ کا تعین کرنے کے لیے ایماویگے ناسٹ (م ۱۹۶۴ء) سے ملے اور اس کے بتانے پر دریائے نیکر کے کنارے واقع اس گھر کی بیرونی دیوار پر یہ پلاک نصب کیا گیا۔

۴۔ اقبال کے ہائیڈل برگ پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد عطیہ فیضی بھی وہاں پہنچ گئیں۔ ان کی آمد اور قیام کی کوئی وجہ؟ تقریباً چار دہائیوں بعد انھوں نے اقبال پر جو انگریزی کتاب سپرد قلم کی وہ آج بھی اقبال کے قیام ہائیڈل برگ کے ضمن میں واحد مستند ماخذ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اول میں چند تصاویر بھی تھیں، جن میں ایک تصویر دریائے نیکر میں اقبال اور عطیہ فیضی کی کشتی رانی کی بھی ہے۔ لیکن افسوس بعد کی طباعتوں یا تراجم میں یہ تصویریں نکال دی گئیں۔

۵۔ کیا ان دنوں یعنی ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ میں اقبال کے علاوہ اور بھی ہندوستانی طلباء زیر تعلیم تھے؟

۶۔ ایماویگے ناسٹ کا آبائی تعلق ہائیڈل برگ کے قریب ایک چھوٹے سے شہر ہائل برون سے تھا۔ان دنوں یہاں اس کی مصروفیت کیا تھی؟ اقبال اوراس کے انتہائی قریبی تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اگر وہ اقبال کو جرمن پڑھا رہی تھی تو کہاں؟

۷۔ ایماویگے ناسٹ زندگی بھر غیر شادی شدہ رہی اوراسی شہر میں وفات پائی۔اقبال کے ہائیڈل برگ سے رخصت ہونے کے بعد اس خوبرو جرمن خاتون نے زندگی کیسے گزاری؟

۸۔ اس کی بڑی بہن صوفی ویگے ناسٹ نے ایک انٹرویو میں، جو ہائیڈل برگ کے ایک مقامی اخبار میں شائع ہوا، میں بتایا کہ ایما، اقبال سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی اوراس مقصد کے لیے وہ ہندستان جانے کو بھی تیار تھی،لیکن وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوسکی۔کیوں؟

۹۔ اقبال اورایماویگے ناسٹ کے مابین جرمن اورانگریزی میں مراسلت ہوتی رہی۔اقبال کے نام ایما کے خطوط تو ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکے لیکن ایما کے نام اقبال کے مکتوبات اس نے اپنی زندگی میں ایک نومسلم جرمن سفارت کار امان اللہ ہوبوہم کی موجودگی میں ایک ''پاکستانی'' کودے دیے تھے،تاکہ وہ ایک عظیم قومی شاعر کی اس امانت کو کسی عجائب گھر میں محفوظ کرادیں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور بالآخر اقبال کی سالانہ برسی (۱۹۷۷ء) موقع پر ہوبوہم صاحب کے توسط سے یہ مراسلات منظرعام پر آئے۔وہ کون ''بااثر'' پاکستانی تھا جس کے حوالے یہ خطوط کیے گئے اور وہ مکتوب الیہ یعنی ایما سے اپنا کیا ہوا وعدہ نہ نبھا سکے؟

۱۰۔ اقبال کی نظم ''دریائے نیکر کے کنارے ایک شام'' کا جرمن ترجمہ دریائے نیکر کے کنارے ایک خوبصورت باغ کے وسط میں پڑے ہوئے پتھر پر کندہ ہے، یہ ترجمہ کس نے کیا؟ اور یہاں کب رکھوایا گیا؟ اسی نظم کا ایک اور جرمن ترجمہ ہائیڈل برگ کے ایک مقامی اخبار میں بھی شائع ہو چکا ہے (۱۹۱۷ء) لیکن مترجم کا نام درج نہیں۔اس شہر سے اقبال کی رخصتی کے دس سال بعد یہ ترجمہ کیسے اشاعت پذیر ہوا؟ اوراس کا ترجمہ کرنے والا کون ہے؟

اگر مناسب سمجھیں تو خالد محمود سنجرانی صاحب ان سوالات کا جواب دے سکتے ہیں، کیوں کہ سنا ہے کہ وہ ہائیڈل برگ میں ایک سال گزار کر واپس تشریف لائے ہیں..... بہرطور سنجرانی صاحب کی مساعی لائق صد تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے قیام جرمنی کے دوران اقبال کا ایک نیا خط دریافت کیا جو یقیناً مکتوبات اقبال کے حالیہ ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ ہے مزید یہ کہ انھوں نے اس مراسلے کے مندرجات پر جو حواشی قلمبند کیے ہیں، وہ ان کی محنت کا بیّن ثبوت ہیں۔

محمد اکرام چغتائی
۱۴۹۔اے،گلشن راوی، لاہور

☆☆☆

''جنوبی ایشیا میں انگریزی زبان کی ترویج: علماء کا ردِّ عمل'' از محمد ارشد، ص۱۹۹۔۲۳۶

فاضل مقالہ نگار نے اس میں حسبِ ذیل اہم مآخذ سے استفادہ نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کے بعض نتائج قدرے کمزور ہیں:

1. Mujeeb Ashraf: Muslim attitude towards British Rule and Western Culture in India.
2. Kejariwal, O.P: Asiatic Society of Bengal and the discovery of India's part.
3. Qurashi, I.H: Ulama in Politics.
4. Troll, C. Islam in India.
5. Troll, C: Sir Syed Ahmed Khan.
6. Works of Dr. Shan Muhammad (of Alighar).

Robinson کی علمائے فرنگی محل کے علاوہ بھی برطانوی ہندوستان پر ایک نہایت قابل توجہ کتاب ہے (جس کا پورا نام اس وقت یاد نہیں ہے)۔ [شاید فاضل مکتوب نگار کی مراد: Separatism among Indian Muslims, 1860- 1924 سے ہے، جو کیمرج یونیورسٹی پریس سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ معیار]

میکگل یونی ورسٹی مونٹریال کے پروفیسر اسمتھ کی برطانوی عہد کے اسلام اور مسلمانوں اور سرسید احمد خان کے افکار کے حوالہ سے بھی اہم کتابیں ہیں۔

Baso کی صرف ایک کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری اہم کتاب: Rise of Christian power in India سے بھی مدد لینا لازم ہے۔

محمد اقبال مجددی
شعبۂ تاریخ، اسلامیہ کالج، لاہور